مثنوی کا فن

شعری اصناف میں مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا حالی نے اسے سب سے کارآمد صنفِ سخن قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ عربی شاعری جس کا رتبہ فارسی شاعری سے کہیں زیادہ بلند ہے ایک معاملے میں فارسی سے پیچھے رہ گئی۔ فارسی میں شاہنامۂ فردوسی اور مثنوی مولانا روم جیسی بلند پایہ مثنویاں موجود ہیں جبکہ عربی کا دامن اس سے خالی ہے۔ مولانا حالی کو افسوس ہے کہ ہمارے شاعر غزل میں الجھے رہے اور مثنوی نگاری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ مولانا کا ارشاد یہ بھی ہے کہ جس طرح پتیلی پکانے والا باورچی دیگ نہیں پکا سکتا اسی طرح غزل کا شاعر مثنوی کے ساتھ انصاف کر بھی نہیں سکتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے تجربات کو شعر کے چھوٹے چھوٹے سانچوں میں ڈھالنے کا ایسا خوگر ہو جاتا ہے کہ تسلسل کے ساتھ سوچنے، کسی عظیم الشان نظم کا منصوبہ بنانے اور اسے تکمیل تک پہنچانے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی۔

اس میں شک نہیں کہ مثنوی کا دامن بہت وسیع ہے۔ کسی طویل قصے یا واقعے کو اس کی تمام تفصیلات اور پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرنے کی گنجایش مثنوی میں باقی تمام اصناف سے زیادہ ہے۔ یہ کہنا درست ہے کہ مثنوی میں ڈرامائی انداز، مرقع نگاری کا کمال، رزمیہ شاعری کا شکوہ، قصیدے کا طمطراق، طربیہ کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کا سوز و گداز اور غزل کی دلکشی سمو لینے کی صلاحیت ہے۔ مولانا حالی نے غزل اور مثنوی کا موازنہ و مقابلہ کر کے شعر و ادب کی کوئی اہم خدمت انجام نہیں دی۔ ان دونوں اصناف کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ غزل میں اختصار و ایجاز کا کمال دکھایا جا سکتا ہے تو مثنوی میں کسی ملک یا کسی قوم کی مکمل تاریخ، کسی شخصیت کی بھرپور سوانح، کسی واقعے کی تفصیل پیش کرنے کی گنجایش ہے۔ منتشر خیالات کی سمائی غزل میں ہے تو ربطِ مضمون اور ارتقائے خیال کے لیے مثنوی کا میدان موجود ہے۔ غزل کا آرٹ غنائی ہے تو مثنوی کا بیانیہ اور توضیحی۔

مولانا حالی نے مثنوی کے فن کو مشکل ٹھہراتے ہوئے جب یہ کہا کہ غزل کا شاعر اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو ان کی مراد یہ تھی کہ مثنوی نگاری کا فن ایک مرکب اور پیچیدہ فن ہے۔ یہ بہت کچھ ناول کے فن سے ملتا جلتا ہے۔ ضروری ہے مثنوی کا پلاٹ مربوط اور گٹھا ہوا ہو، واقعات منطقی طور پر آگے بڑھیں۔ قصے میں آغاز، وسط اور انتہا موجود ہو۔ تصادم کے مواقع فراہم ہوں تو قصے کی جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کرداروں کے بغیر کوئی قصہ وجود میں نہیں آسکتا۔ کردار حقیقی اور جیتے جاگتے ہوں۔ جہاں مکالموں کی نوبت آئے وہاں یہ خیال رکھا جائے کہ جس کے منہ سے جو بات ادا کرائی جائے وہ اس کردار سے مکمل مطابقت رکھتی ہو۔ گویا بالکل فطری ہو۔

مثنوی کی اصل شناخت ہے حقائق نگاری۔ جو واقعہ یا واقعات مثنوی میں پیش کیے جا رہے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اصلی ہوں اور سچ مچ پیش آئے ہوں مگر یہ ضروری ہے کہ وہ بالکل اصلی اور سچے دکھائی دیں۔ اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ عشق کا کوئی قصہ، جنگ کا کوئی واقعہ، کسی کی زندگی کے حالات، پند و نصائح، فلسفہ، تصوف، مثنوی کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں۔ مثنوی بے حد مختصر بھی ہو سکتی ہے اور نہایت طویل بھی۔ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ یا ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غزل اور قصیدے کی طرح تمام اشعار میں یکساں قافیے اور ردیف نہیں ہوتے۔ اس سے شاعر کو سہولت ہو جاتی ہے اور وہ کسی رکاوٹ کے بغیر شعر کہتا چلا جاتا ہے۔ مثنوی نگار سادہ زبان بھی استعمال کر سکتا ہے جس سے قاری روانی کے ساتھ آگے بڑھتا جائے لیکن مثنوی کی زبان مرصع بھی ہو سکتی ہے اور زیادہ سے زیادہ شعری وسائل اور فنی تدابیر سے کام لینا بھی ممکن ہے۔

علامہ شبلی نے مثنوی کے لیے تین اوصاف کو ضروری ٹھہرایا ہے۔ یہ ہیں: حسن ترتیب، کردار نگاری اور واقعہ نگاری۔ ذیل میں ان تینوں خصوصیات پر الگ الگ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

حسنِ ترتیب :۔ مثنوی نگار جس واقعے یا قصے کا انتخاب کرتا ہے وہ خام مواد کی شکل میں اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اس میں اہم اور غیر اہم چیزیں بے ترتیب موجود ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس انبار میں سے غیر ضروری چیزوں کو چھانٹ کر الگ کر دینا ہوتا ہے۔ پھر جو اہم مواد باقی بچتا ہے اسے مرتب کرنے کا مرحلہ پیش آتا ہے۔ اس کے لیے فنکار اپنے ذہن میں ایک خاکا تیار کرتا ہے کہ قصے کی شروعات کہاں سے ہو گی اور پھر کن مرحلوں سے گزرتا ہوا وہ انجام تک پہنچے گا۔ کچھ ضمنی واقعات کو بھی وہ مثنوی میں داخل

کر سکتا ہے مگر یہ دیکھ لینا بہرحال ضروری ہوتا ہے کہ یہ ضمنی واقعات اصل واقعے یا قصے کو آگے بڑھانے میں یا تاثر کو ابھارنے یا پورے پلاٹ میں دلکشی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں۔ ان واقعات کو ایک کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی ضمنی واقعے کو مثنوی سے الگ کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کو الگ کر دینے سے پلاٹ مجروح ہوا یا نہیں۔ اگر اسے چھانٹ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑا تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ضمنی واقعہ یا قصہ غیر ضروری ہے۔ اردو میں اعلا درجے کی مثنویوں کا فقدان ہے۔ قطب مشتری ایسی عجلت میں لکھی گئی کہ شاعر کو یہ غور کرنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ کون سے واقعات ضروری ہیں اور کون سے غیر ضروری۔ مثلاً مثنوی قطب مشتری میں مہتاب پری سے شہزادے کی ملاقات غیر ضروری ہے۔ جیسے ہی مصنف کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے وہ مہتاب اور شہزادے کو بہن بھائی بنا دیتا ہے۔ اسی طرح مثنوی گلزار نسیم میں بہرام اور روح افزا پری کے عشق کا قصہ بھی مثنوی کے پلاٹ کا جزو نہیں بن پایا۔ وہ الگ ہی ایک ضمنی واقعہ ہے جس سے بنیادی قصے کو آگے بڑھانے میں مدد نہیں ملتی۔ نہ اس سے مثنوی کی دلکشی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری مثنویوں میں مربوط، منظم اور گتھے ہوئے پلاٹ کی کمی ہے۔ شوق کی مثنوی زہر عشق کا پلاٹ ان میں بہتر اور زیادہ مربوط ہے۔

کردار نگاری :— کوئی مختصر واقعہ ہو یا کوئی طویل قصہ کرداروں کے بغیر وہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے کردار نگاری مثنوی کے لیے نہایت اہم ہے۔ کردار نگاری میں اصلیت ہو اور کردار جیتے جاگتے اور متحرک ہوں تو مثنوی میں جان پڑ جاتی ہے۔ جہاں مصنف کو ایک جیسے کئی کردار پیش کرنے ہوتے ہیں وہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہیں سب ایک جیسے نظر نہ آئیں۔ مثلاً کسی بادشاہ کے پانچ بیٹے ہیں۔ اگر ان سب کے عادات و اطوار، ان کے سوچنے کا ڈھنگ، ان کے کام کرنے کا طریقہ یکساں ہو تو ٹائپ کیریکٹر کہلائیں گے۔ یہ کردار سپاٹ اور انفرادیت سے محروم ہوں گے۔ جو کردار زندگی سے بھرپور ہوں اور اپنی انفرادیت بھی رکھتے ہوں وہ زیادہ قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ کردار نگاری میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو انسانی نفسیات کا گہرا علم رکھتا ہو۔

یہ بات نہایت اہم ہے کہ ہر کردار کا اپنا مزاج ہونا چاہیے اور وہ پورے قصے میں جو بھی عمل کرے وہ اس کی بنیادی سرشت کے مطابق ہو۔ البتہ حالات کے مطابق اس میں تبدیلی رونما ہو تو اسے کردار کا ارتقا کہا جائے گا اور یہ ایک خوبی ہوگی۔ نسیم نے اپنی مثنوی میں دکھایا ہے کہ ایک بادشاہ کے چار بیٹے تھے اور سب کے سب ذہین اور عقل مند تھے۔

آج غیر عقلی، غیر فطری اور خلافِ عقل باتوں کو اپنی تصنیف میں پیش نہیں کرتا کیونکہ آج کا قاری ان پر یقین نہیں کر سکتا۔

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ (۱) مثنوی میں ربطِ کلام ہونا چاہیے یعنی تسلسل برقرار رہے اور بات سے بات نکلتی جائے (۲) فوقِ فطری یعنی خلافِ عقل باتوں سے پرہیز کیا جائے (۳) مبالغہ آرائی نہ ہو۔ بات کو بڑھا چڑھا کر کہا جائے تو اس کا اثر جاتا رہتا ہے (۴) کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو۔ مطلب یہ کہ جس کردار کی زبان سے جو کچھ کہلوایا جائے معلوم ہو کہ اس موقعے پر یہ کردار یہی کہہ سکتا تھا (۵) جس مقام اور جن لوگوں کا بیان ہے وہ بالکل درست ہو اور ان کی تصویر کھینچ دے (۶) بیان میں قصے کی تکذیب نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ ابھی کچھ کہا ابھی اس کے خلاف کہہ دیا (۷) کوئی چیز تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ ہو (۸) ضروری جزئیات سلیقے کے ساتھ پیش کی جائیں (۹) بیان میں فصاحت ہو۔ جہاں تک ممکن ہو زبان فطری اور سادہ ہو تاکہ قاری کی توجہ قصے پر مرکوز رہے۔

* *